تکلیف سے بچنے کے لئے وہ مناسب احکام صادر کرتی ہے۔ اسی طرح اگر برف کی ڈلی ہاتھ میں آ جائے تو روحِ حیوانی اس کا اِدراک کرتے ہی مثلاً یہ ہدایت دیتی ہے کہ اس برف سے پانی ٹھنڈا کیا جائے۔ اس کے برخلاف روحِ مَلکوتی کے لئے جو باتیں موجب لذت ہوتی ہیں یا جو اعمال موجب الم ہوتے ہیں فوری طور پر اُن کا اثر دنیا میں ظاہر نہیں ہوتا' کیونکہ روحِ مَلکوتی بہیمیت کے لبادے یا خول میں ہونے کی وجہ سے ایک طرح سے سن اور وقتی طور پر بے حس ہو جاتی ہے۔ مگر جب بہیمیت کو کمزور کر دیا جاتا ہے یا جب موت کے بعد بہیمیت کا لبادہ یکسر اتر جاتا ہے تب مَلکیت کو پوری شدت کے ساتھ اس لذت یا اَلم کا اِدراک ہوتا ہے۔ چنانچہ عالمِ آخرت میں انسان کے اچھے اعمال حسین باغات اور دودھ یا شہد کی نہروں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اس کے برے اعمال جہنم کی آگ' زقوم کا درخت اور کھولتا ہوا پانی بن کر بدکار کی مَلکیت کے لئے عذاب کا سامان بن جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیثِ قدسی میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد اس طرح بیان ہوا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے:

((يَا عِبَادِىْ اِنَّمَا هِىَ اَعْمَالُكُمْ اُحْصِيْهَا لَكُمْ)) (صحیح مسلم)

''اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی اعمال تو ہیں جو میں نے تمہارے لئے گن گن کر رکھے تھے۔''

اسی طرح سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہے کہ اہل جنت کو جب بھی جنت کا کوئی میوہ عطا ہوگا تو وہ پکار اٹھیں گے ﴿هٰذَا الَّذِىْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ﴾ ''یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے ہی سے دیا گیا تھا'' (یعنی اس پھل کی لذت تو وہی ہے جو اس نیکی کی لذت تھی جس کی توفیق ہم کو دنیا میں ملی تھی)۔ واللہ اعلم!

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

فکر اسلامی کا عظیم سرمایہ (۲)

ایک مطالعاتی جائزہ

تحریر: محمد موسیٰ بھٹو

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کی تصانیف سے مزید اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

انبیاء کی تعلیمات کا ماحاصل

اگر پوچھا جائے کہ ان لاتعداد انبیاء کی تعلیم کا ماحاصل یا روح یا نچوڑ کیا تھا، تو ہم ایک لفظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ ''محبت'' ——— اسلام محبت کی تعلیم دیتا ہے ——— ایسی محبت کی تعلیم جو خالص، بے لاگ اور بے غرض ہو، جو دائمی اور لازوال ہو، جو اپنے کمال کی طرف ہمیشہ بڑھتی رہے اور جس میں کمی یا مایوسی کا قطعاً کوئی امکان موجود نہ ہو۔ سوال یہ ہے کہ قدرت کو اس تکلف کی ضرورت کیا تھی؟ اس نے کیوں انسان کو اپنے حال پر نہ چھوڑ دیا اور کیوں پے درپے انبیاء بھیجے، تاکہ انسان کو ایک خالص، کامل اور لازوال محبت کی تعلیم دیں؟ اس کی وجہ نہایت معقول ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت اس قسم کی محبت کی پیاسی ہے۔ انسان اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ وہ اس قسم کی محبت کے لئے بے قرار ہے، تڑپ رہا ہے۔ وہ ہر آن اور ہر لحہ اس قسم کی محبت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس نے اپنی ساری زندگی اسی کی تلاش کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ وہ اس کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتا ہے، بڑی ہلاکت خیز مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے، جان پر کھیل جاتا ہے، لیکن اس کی تلاش نہیں چھوڑتا ——— کیونکہ چھوڑ ہی نہیں سکتا، یہ محبت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ ایک ایسے محبوب کی تلاش کرے جو اس کی فطرت کے تقاضائے محبت کو بتمام وکمال پورا کر سکے، جسے وہ دل وجان سے چاہے اور جس سے الفت کرے۔

پہلے انسان سے لے کر آج تک نوعِ بشر کی ساری تاریخ اسی محبوب کی تلاش کی ایک طویل داستان ہے، جس کے اکثر باب گو خونچکاں اور دلفگار ہیں، لیکن بعض دل افروز اور دل نواز بھی ہیں۔ خدا کے انبیاء اس لئے آئے، تا کہ انسان کو بتائیں کہ وہ جس محبوب کو چاہتا ہے وہ کون ہے اور اس سے محبت کرنے اور اس کی محبت اور رضامندی حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ گویا دین اسلام، دین قیم یا انبیاء کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اس کی دائمی اور غیر مبدل فطرت کے تقاضوں کا صحیح علم بہم پہنچایا جائے، تا کہ اس علم کی مدد سے وہ ان کو باحسن طریق پورا کر سکے۔

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ﴾ (الروم: ۳۰)

''اپنا رُخ خالص دینِ اسلام کی طرف کر لو۔ یہ اللہ کی فطرت ہے، جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی دین قیم ہے''۔

ایک حدیث میں ہے:

((مَامِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ)) (متفق علیه)

''ہر بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بناتے ہیں''۔ (روحِ اسلام، صفحہ ۸)

حق تعالیٰ کی صفتِ محبت کو قرآن نے رحمت کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے:

﴿كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ (الانعام: ۱۲)

''اس نے اپنے آپ پر محبت کو فرض کر لیا ہے''۔

﴿رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ﴾ (الاعراف: ۱۵۶)

''میری محبت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے''۔

یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے لئے ''الرحمٰن'' کا نام پسند کرتا ہے، جس کے معنی ہیں عام رحمت کرنے والا۔ خدا کی محبت انسان کے لئے ہے اور وہ توقع رکھتا ہے کہ انسان بھی اس سے محبت کرے۔ اس نے انسان کی تخلیق اس طرح کی ہے کہ اس کی اپنی صفات کی

طرح انسان کی صفات کا مرکز بھی محبت ہی کو بنایا ہے۔ اس محبت کی صفت کی وجہ سے انسان خدا کی باقی صفات سے' جو محبت کی مؤید اور معاون ہیں' حصہ لیتا ہے۔ حدیث کے الفاظ: ''اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ'' کا مطلب یہی ہے۔

اپنی فطرت کے اندر صفاتِ ربانی کا پَرتو رکھنے کی وجہ سے ہی انسان خدا کا خلیفہ قرار پایا ہے۔ انسان کا فطرتی جذبۂ محبت صرف خدا کی محبت اور عبادت سے مطمئن ہوتا ہے اور خدا کی عبادت کا مقصد یہ ہے کہ انسان جس حد تک کہ اس کے لئے ممکن ہو' اپنے آپ کو خدا کے اوصاف کے ساتھ متصف اور اس کے اخلاق کے ساتھ متخلق کرے۔ اس راہ میں وہ جس قدر زیادہ ترقی کرے گا اسی قدر خدا کی محبت اور نیابت کا اہل ہوگا۔ (روحِ اسلام' صفحہ ۱۸)

مُحبّت کے نصب العین کی کامل تعلیم کے لئے خدا کی طرف سے نبوت کا اہتمام

اگر تمام پیغمبروں کی تعلیمات کا خلاصہ صرف ایک لفظ میں بیان کرنے کا مطالبہ کیا جائے تو وہ لفظ ''محبت'' ہے۔ اسلام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ محبت کریں اور اپنی محبت کو جس قدر زیادہ پاکیزہ' یکسو' خالص' بےلوث اور صمیم قلب سے صادر ہونے والی بنا سکتے ہیں بنائیں اور پھر اُن کی محبت ایسی ہو کہ وہ ہمیشہ عظیم سے عظیم تر' کمالِ پاکیزگی اور خلوص کی جانب بڑھتی رہے اور اس میں ایک لمحہ کے لئے بھی کسی کمی' کمزوری یا مایوسی کے آثار پیدا نہ ہوں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نبوت کا ظہور درحقیقت کارخانۂ قدرت میں کسی مقصد کو پورا کرتا ہے؟ کیا انسان کو واقعی اس بات کی ضرورت ہے کہ اسے کامل' دائمی اور مخلصانہ محبت کی تربیت اور ترقی کا وہ طریقہ سکھایا جائے جس کی تعلیم انبیاء دیتے چلے آئے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک کامل' پائیدار اور مخلصانہ محبت جو ایک نصب العین کے حصول کی والہانہ شکل اختیار کرتی ہے' انسان کی تمام فطری خواہشات میں سب سے زیادہ طاقتور ہے اور سب خواہشات پر غالب آنے والی خواہش ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ خواہش چونکہ انسان کی تمام دوسری خواہشات کو اپنے تابع رکھتی ہے' بلکہ یوں کہنا

چاہئے کہ وہ دراصل اس کی فطرت کی ایک ہی خواہش ہے اور انسان اسی خواہش سے عبارت ہے اور نبوت کی اہمیت یہ ہے کہ صرف وہی انسان کی اس خواہش کی صحیح، مکمل اور مستقل تشفی کا ذریعہ ہے' لہٰذا نبوت کا عالمِ فطرت میں ایک خاص مقصد ہی نہیں' بلکہ وہ کارخانۂ قدرت کے نظم ونسق کو چلانے کے لئے ناگزیر ہے۔ (منشور اسلام' صفحہ ۱۵)

نصب العین کی خواہش کی انسان کی نفسیاتی اور جمالیاتی خواہشات پر ہی نہیں' بلکہ اس کی جبلتی خواہشات پر بھی حکمرانی ہے۔ ایک حیوان کے لئے ناممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنی کسی جبلتی خواہش کے دباؤ کو روک سکے۔ اس کے برعکس انسان اپنی کسی جبلتی خواہش کی تشفی اس وقت تک نہیں کرسکتا جب تک کہ اس کا نصب العین اجازت نہ دے اور وہ اپنی ہر جبلتی خواہش کی تشفی صرف اس حد تک کرتا ہے جس حد تک اس کا نصب العین اجازت دیتا ہو۔ جب ایک انسان کا نصب العین یہ تقاضا کرتا ہو کہ وہ اپنی زندگی کو قائم رکھے' تو وہ اس کو قائم رکھنے کے لئے اپنی جبلتی خواہشات کی مناسب تشفی کے لئے پوری کوشش کرتا ہے' لیکن جب نصب العین کا تقاضا یہ ہو کہ انسان اپنی زندگی کو اس کی حفاظت کے لئے قربان کر کے شہید ہو جائے تو وہ جبلتی خواہشات کی تشفی سے ہی نہیں بلکہ خود زندگی سے بے پرواہ ہو جاتا ہے اور اسے قربان کرنے کے لئے بخوشی آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو ان لاتعداد واقعات کی تشریح کرتی ہے جو ہر روز ہمارے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں کہ فلاں شخص نے اپنے نصب العین کی خاطر یہ جانتے ہوئے زندان میں جانا قبول کرلیا ہے کہ وہاں اسے اپنی جبلتی ضروریات کو روکنا یا ترک کرنا پڑے گا یا اسے سخت قسم کی بدنی صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کرنے کے سوائے چارہ نہ ہوگا یا فلاں شخص نے نصب العین کی خاطر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا ہے یا دار پر چڑھنا یا میدانِ جنگ میں گولی کھا کر مرجانا قبول کرلیا ہے۔

اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ انسان بالآخر اور درحقیقت صرف ایک ہی خواہش رکھتا ہے اور وہ کسی نصب العین کی خواہش ہوتی ہے۔ اس کی باقی ماندہ تمام نفسیاتی یا جبلتی خواہشات اس ایک خواہش کے تابع اور اس کی خدمت گزار ہوتی ہیں۔

یہی ایک خواہش اس کے تمام اعمال و افعال کی اصلی اور بنیادی قوتِ محرکہ ہوتی ہے اور اس کی فطرت کی کوئی اور قوت اس کے کسی عمل یا فعل کو پیدا نہیں کرتی۔ یہی خواہش فطرتِ انسانی کا وہ طاقتور اور زبردست جذبۂ عمل ہے جس کو فرائڈ نے غلطی سے جنسی محبت کا جذبہ سمجھا ہے' جسے ایڈلر نے نادانی سے قوت یا غلبہ حاصل کرنے کی خواہش کا جذبہ قرار دیا ہے' جس پر میکڈوگل کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ وہ انسان کی جبلتی یا حیوانی خواہش کے ایک پُر اسرار مرکب کا جذبہ ہے اور جسے کارل مارکس نے بلا دلیل یہ فرض کر لیا ہے کہ وہ انسان کی اقتصادی ضروریات کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔ (منشور اسلام' صفحہ ۹)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان جس نصب العین کی جستجو کر رہا ہے وہ اس کے اندرونی فی الواقع کون سے اوصاف کی موجودگی کی توقع کرتا ہے' اس سوال کا جواب نصب العین کے لئے انسان کی فطری خواہش کی نوعیت کے اندر پہلے ہی سے موجود ہے' کیونکہ یہ خواہش حسن کے لئے ہے' وہ صرف ایک ایسے نصب العین سے ہی مطمئن ہو سکتی ہے جو منتہائے حسن و کمال ہو۔ یعنی:

(۱) جو ہر اُس نقص و عیب سے پاک ہو جس کا ہم انسان ہونے کی حیثیت سے تصور کر سکتے ہیں ——— اور

(۲) جس میں وہ تمام اوصاف بدرجۂ کمال موجود ہوں جن کو ہم اپنی فطرت کے تقاضوں کی بنا پر عمدہ' حسین اور قابلِ ستائش اور لائقِ محبت سمجھتے ہیں۔

نقص یا عیب محبت کا دشمن ہے' لہٰذا جونہی انسان کو اپنے نصبُ العین کے اندر کسی چھوٹے سے چھوٹے نقص کی موجودگی کا یا کسی چھوٹی خوبی کی عدم موجودگی کا بھی پتہ چلتا ہے تو اس کی محبت کافور ہو جاتی ہے' بلکہ نفرت میں بدل جاتی ہے۔ بے شک ایک انسان ایک زشتِ ناقص یا گھٹیا نصب العین سے بھی محبت کر سکتا ہے اور کرتا ہے' لیکن صرف اس وقت تک جب تک کہ وہ اس کی طرف غلطی سے حسن اور کمال کے وہ تمام اوصاف منسوب کر سکے جن کا وہ تصور کر سکتا ہے اور اپنے آپ کو دھوکہ دے سکے کہ یہ اوصاف درحقیقت اس کے اندر موجود ہیں۔ (منشورِ اسلام' صفحہ ۲۱)

باطل نصب العین کی طرف حسن و کمال کی صفات منسوب کرنے کی انسانی روش

انسان کے نصب العین کی محولہ بالا دو عمومی اور بنیادی صفات کے اندر اور بہت سی صفات مضمر ہیں، جن کا ہم اسی طرح ان صفات سے استخراج کر سکتے ہیں۔ چونکہ انسان کی فطرت کی رُو سے یہی وہ صفات ہیں جو انسان اپنے نصب العین کے اندر موجود دیکھنا چاہتا ہے، لہٰذا خواہ اس کا نصب العین کچھ ہو، ایک پتھر ہو، یا ایک درخت ہو، یا دریا ہو، یا پہاڑ ہو، یا ایک بُت ہو، یا قوم، یا نسل، یا وطن، یا ایک نظریہ یا ازم، وہ ان صفات کو اپنے نصب العین کی طرف ہر حالت میں منسوب کرتا ہے۔ بعض کو شعوری اور دانستہ طور پر اور بعض کو غیر شعوری اور نادانستہ طور پر۔ مثلاً خواہ انسان کا نصب العین کوئی مادی چیز ہو یا کوئی تصور، اس کا چاہنے والا اس کے ساتھ اس طرح سے برتاؤ کرتا ہے کہ گویا وہ ایک شخصیت ہے، جس میں زندگی، قوت، حسن، نیکی اور صداقت کے تمام اوصاف پائے جاتے ہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جو اس کے لئے ممکن بناتی ہے کہ وہ اس سے محبت کرے اور اس کی ستائش اور پرستش کرے اور اس کی خدمت کے لئے بڑی بڑی مصیبتیں اٹھائے۔ (منشورِ اسلام، صفحہ ۲۵)

اب غور فرمایئے کہ ایک طرف سے تو انسان کے اندر ایک ایسے نصب العین کی محبت کا زبردست جذبہ موجود ہے جو خالقِ کائنات ہو اور بدرجۂ کمال حُسن، نیکی، صداقت اور قوت کی صفات کا مالک ہو اور دوسری طرف سے کائنات کی کوئی تشریح اس سے زیادہ قابلِ یقین اور حقائقِ معلومہ اور مسلّمہ کے مطابق نہیں کہ کائنات کی حقیقت ایک ایسا وجود ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے اور جو بدرجۂ کمال حُسن، نیکی، صداقت اور قوت کی صفات کا مالک ہے۔ اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ وہ نصب العین جسے نوعِ انسانی تاریخ کی کٹھن منزلوں میں تلاش کر رہی ہے (یعنی انسان کا صحیح نصب العین) خود حقیقتِ کائنات کے سوائے اور کوئی نہیں۔ یہ ہے وہ ناقابلِ انکار اور عظیم الشان صداقت جسے انبیاء علیہم السلام پیش کرتے ہیں اور جس پر وہ زور دیتے ہیں۔ ہر نبی جو دنیا میں آیا، اس کی دعوت کی ابتداء اور انتہا یہ تھی کہ اس نے لوگوں کو مخاطب کر کے

کہا: لا الہ الا اللہ۔ خدا کے سوائے کوئی معبود نہیں' جو (اپنی صفات کی بناء پر) تمہاری محبت' ستائش' پرستش اور خدمت کا حق دار ہو۔

خاتم الانبیاء ﷺ نے اعلان فرمایا تھا:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (البقرۃ: ۲۱)

''اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور ان لوگوں کو بھی پیدا کیا تھا جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں''۔ (ایضاً صفحہ ۲۶)

تعلیمِ نبوت سے بے نیازی کی وجہ سے شخصیت کا غلط نصب العین کی راہ اختیار کرنا

تعلیمِ نبوت کی مطلق اہمیت اس بات سے پیدا ہوتی ہے کہ نصب العین کے لئے انسان کی آرزو نہ دبائی جا سکتی ہے اور نہ روکی جا سکتی ہے۔ جب ایک انسان اپنی حماقت یا بے پروائی کی وجہ سے نبوت کی راہ نمائی سے مستفید نہیں ہوتا اور صحیح نصب العین کی محبت سے محروم رہ جاتا ہے تو پھر ایسا نہیں ہوتا کہ نصب العین کے لئے اس کی محبت کا جذبہ رک جائے یا دب کر ختم ہو جائے' بلکہ وہ ایک غلط نصب العین کی راہ سے اپنا اظہار پانے لگتا ہے۔ اور جب ایک انسان اس طرح ایک غلط نصب العین سے محبت کرنے لگ جائے تو وہ بعد میں اس خطرناک اور بے بنیاد محبت کے شدید نقصانات کا سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک انسان جو اچھی اور صحت بخش غذا نہ پا سکے' اپنی بھوک کو روک نہیں سکتا' بلکہ جو غذا بھی اسے مل جائے' خواہ وہ کیسی ہی مضرِ صحت اور خطرناک ہو' اسی سے اپنا پیٹ بھرنے پر مجبور ہوتا ہے' لیکن بعد میں اس غذا کے شدید نقصانات کا سامنا کرنے سے بچ نہیں سکتا۔ (ایضاً)

نصب العین کی محبت معلومات سے پیدا نہیں ہوتی

محض یہ سن لینا یا اطلاع رکھنا کہ فلاں نصب العین حسین ہے' کسی انسان کے دل میں اس نصب العین کی محبت پیدا نہیں کر سکتا۔ ایک نصب العین کی محبت صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب اس کے حسن کو فی الواقع محسوس کیا جائے۔ ضروری

ہے کہ ایک دریا جس کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کر دی گئی ہو اپنا راستہ بدلے اور زمین کی اس سطح پر بہنا شروع کر دے جو اس کے پانی کو اپنی خاص بلندی کی وجہ سے قبول کر سکتی ہو خواہ اس کے نتائج کھیتوں اور انسانی آبادیوں کے لئے کچھ ہوں۔ اسی طرح سے جو انسان اپنے صحیح نصب العین کے حسن کو محسوس نہ کر سکے' ضروری ہے کہ اس کے جذبۂ حسن کا زوردار بہاؤ اپنا فطری راستہ بدل لے اور ایک ایسے تصورِ حسن کی راہ سے اپنا اظہار پانے لگ جائے جو حسین تو نہیں' لیکن جس کا فرضی حسن وہ اپنی نادانی اور علمی بے مائیگی کی وجہ سے اس طرح محسوس کرتا ہے جس طرح سے بیاباں میں ایک پیاسا سراب کو پانی سمجھتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں وہ اسے غلطی سے صحیح نصب العین یعنی خدا سمجھ لیتا ہے اور لہٰذا اسے دل و جان سے چاہنے لگتا ہے اور اس سے ویسی ہی محبت کرتا ہے' اس کی ویسی ہی خدمت کرتا ہے' ویسی ہی ستائش کرتا ہے اور ویسی ہی پرستش کرتا ہے جیسی کہ اللہ کے لئے ہونی چاہئے۔ قرآن حکیم نے انسان کی فطرت کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ (البقرة: ١٦٥)

''لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو خدا کو چھوڑ کر اوروں کو معبود بنا لیتے ہیں اور پھر اُن سے ویسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی خدا سے کرنی چاہئے۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں' خدا سے شدید محبت رکھتے ہیں''۔ (ایضاً' ص ۲۹'۳۰)

ذکر و فکر اور عبادت شخصیت کے ارتقاء کو نکتۂ کمال تک پہنچانے کا ذریعہ ہے

انسان کا وہ عمل جسے خدا کی عبادت کا نام دیا جاتا ہے اور جس کا بڑا عنصر ذکر ہے' انسان کے تجربات میں سب سے زیادہ قیمتی اور اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس کے ذریعہ سے انسان اپنی زندگی کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی آرزو کو اپنا صحیح اور قدرتی اظہار پانے کا موقع دیتا ہے اور اس طریق سے اس کی مکمل اور مستقل تشفی کر کے اپنی شخصیت کے ارتقاء کو نکتۂ کمال پر پہنچانے کا

اہتمام کرتا ہے۔ یہ گویا انسانی خودی کا اپنے مبدأ کی طرف عود اور اپنی منزلِ مقصود کی طرف رجوع ہے۔ یہ دو بچھڑے ہوئے عاشقوں کی ملاقات ہے جو کروڑ ہا برس کے ارتقائی عمل کی صورت اختیار کرنے والی ایک دوسرے کی طویل جستجو کے بعد اُن کو میسر آتی ہے۔ اقبال ہمیں بتاتا ہے کہ عبادت ایک فطری عمل ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے سائنس دانوں کی جستجوئے صداقت کا ہی ایک تتمہ ہے۔

عبادت کا منبع انسان کی فطرت میں ہے۔ فکر کے ذریعہ سے شعور حقیقت کے عمل کو دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ ذکر کے دوران یہ سست رفتاری سے منکشف ہونے والے عالمگیری اصولوں کی جستجو کی قوت کی حیثیت سے اپنا کام ترک کر دیتا ہے اور فکر سے بالا ہو کر براہِ راست حقیقت کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہے' تا کہ اس کے کام میں ارادی طور پر شرکت کر سکے۔ اس میں کوئی مخفی یا نا قابلِ فہم بات نہیں۔ عبادت حصولِ تجلی کے ایک ذریعہ کے طور پر ایک قدرتی حیاتیاتی فعل ہے جس سے ہماری شخصیت کا چھوٹا سا جزیرہ اچانک ہی زندگی کی بڑی وحدت میں اپنا مقام دریافت کر لیتا ہے۔ دراصل عبادت کو قدرت کا مشاہدہ کرنے والے انسان کی جستجوئے علم کا ایک ضروری تتمہ سمجھنا چاہئے۔ قدرت کا سائنسی مشاہدہ حقیقت کے کردار کے ساتھ ہماری گہری وابستگی قائم کرتا ہے اور اس طرح سے اس کے زیادہ گہرے مطالعہ کے لئے ہمارے وجدان کو تیز تر کرتا ہے...... سچ بات یہ ہے کہ علم کی ساری جستجو ہی دراصل ایک قسم کی عبادت ہے اور قدرت کا مشاہدہ کرنے والا سائنسدان ایک قسم کا جویائے حق صوفی ہے' جو عبادت کر رہا ہے۔ (حکمتِ اقبال' صفحہ ۲۵۹)

حقیقت کے سارے علم کا انسان کے اندر موجزن ہونا
اور فطرت کا اسے صرف جگانے کا کام سرانجام دینا

دہریت اگر کہیں ہے تو محض زبانوں پر ہے' انسانوں کے دلوں پر اس کا کہیں قبضہ نہیں ہوا۔ تصورِ خالق رکھنے کا سبب اپنے ماحول سے تعلق رکھنے کی وجہ سے نہیں' اور یہ

محض خارجی نہیں' بلکہ داخلی بھی ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے' ہماری فطرت میں کسی عظیم وجمیل ہستی کی آرزو خوابیدہ ہے' جسے ہمارا شعور تلاش کر رہا ہے۔ چنانچہ اس طرح خارجی فطرت کی علامت اور داخلی آرزو دونوں باہمی تعلق قائم کرتی ہیں اور ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں۔ اس تعلق وتقویت کا ہمیں جتنا زیادہ علم ہوتا ہے اتنا ہی ہم اس دنیا میں آرام وسکون محسوس کرتے ہیں اور اپنی حقیقت سے باخبر ہو جانے کی وجہ سے ہمیں اتنی ہی راحت ومسرت حاصل ہوتی ہے۔ درحقیقت ہمارا خالق کو ماننا خارجی کی نسبت داخلی زیادہ ہے۔ ایک کامل ہستی کی آرزو کے بغیر ہم کبھی فطرت کی تعریف کرنے یا اس پر غور وفکر کر کے خالق کا تصور پیدا کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے تھے۔ حقیقت کا تمام علم خود ہمارے اندر ہے' فطرت اسے صرف جگا دیتی ہے۔ پھر اگر اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو یہ اپنے آپ میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ شعورِ ایزدی کا ہر علم جو ہمیں حاصل ہوتا ہے' فوراً ہمارے شعور کا علم بھی ہوتا ہے۔ خالق پر ایمان لانا اپنے آپ پر ایمان لانا ہے۔ (ماہنامہ اسلامی تعلیم' مئی جون ۱۹۷۳ء' مضمون بعنوان ''وجدان اور عبادت'')

احساس علم کی اعلیٰ ترین قسم ہے جس کے زیرِ اثر زندگی کی راہیں تراشی جاتی ہیں' حسن کا علم صرف احساس کے ذریعہ ہونا

''شعورِ انسانی کی طرح شعورِ ایزدی کے متعلق بھی ہمارا تمام علم سائنسی ہے نہ عقلی۔ یہ دونوں لفظ حقیقت کے مروّج علوم میں استعمال کئے گئے ہیں۔ اس کی نوعیت کچھ احساس' حساسیت' وجدان' ایمان یا عینی مشاہدہ کی سی ہے۔ احساس صرف علم ہی نہیں' بلکہ علم کی اعلیٰ ترین قسم بھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عقل احساس کو تیز تر کر دیتی ہے' لیکن احساس محض عقل کی نسبت بہت کچھ زیادہ جانتا ہے۔ عقل کسی شے کا محض ایک جزو سمجھ سکتی ہے لیکن احساس کُل پر حاوی ہوتا ہے۔ اس بات کا اندازہ بہت کم لگایا جاتا ہے کہ یہ علم جس کے زیرِ اثر ہم اپنی زندگی کی راہیں تراشتے ہیں' کبھی خالص منطقی'

علمی یا ذہنی نہیں ہوتا' یہ ایک احساس کی نوعیت ہوتی ہے' تاہم ذہانت ہی اس کی کم وبیش رہنمائی کرتی ہے۔ ہم وہی کچھ کرتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں اور یہ ہرگز نہیں دیکھتے کہ مدلل' معقول یا ریاضیاتی طور پر صحیح کیا ہے؟ ہماری زندگی کا رہنما اصول محبت ہے' منطق نہیں' اور جیسا کہ ہم دیکھ سکتے ہیں' انسانی زندگی کا داعیہ محبت یا احساسِ حسن ہے' ذہانت داعیہ نہیں بن سکتی' کیونکہ یہ نہ حُسن کا علم رکھ سکتی ہے' نہ احساس کرسکتی ہے۔ ایک سائنس دان ہمیں یہ تو بتا سکتا ہے کہ آواز کس طرح پیدا ہوتی ہے' لیکن یہ نہیں بتا سکتا کہ نغمہ شیریں اور حسین کیوں ہے۔ وہ تصویر کا احاطہ اور رقبہ ٹھیک ٹھیک ماپ کر بتا سکتا ہے۔ وہ یہ بتا سکتا ہے کہ روشنی کی شعاعوں کا کیا حصّہ ہے اور آنکھ کا پردہ' اعصابِ بصارت یا دماغ اسے دیکھنے میں کہاں تک مدد کرتے ہیں۔ وہ اس میں مستعمل رنگوں میں جزئیات تک بیان کرسکتا ہے' لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتا کہ تصویر کا حسن کس شے پر مشتمل ہے۔ وہ فوراً اس کے حسن سے متاثر ہوسکتا ہے' لیکن وہ منطقی یا علمی طور پر اس کا مظاہرہ نہیں کرسکتا۔ حسن کا علم صرف احساس کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے' یہ عقلیت کی دسترس سے باہر ہے۔ (ایضاً)

راستہ کا اہم حصّہ احساس کی رفاقت میں طے ہونا

احساس مجموعی نفس کا فعل ہے' ذہانت اس کا ایک حصّہ ہے۔ نفس کُل کو دیکھتا ہے' لیکن ذہانت کی نظر محض ایک جزو پر ہوتی ہے۔ حال ہی میں نفسیات کے مدرسہ گشٹالٹ نے کُل' تمام' یا کلیت پر زور دیا ہے' جو محض عینی مشاہدہ یا حساسیت کی بدولت جانی جاسکتی ہے۔ ایک تصویر یا ایک نغمہ کُل ہے' جو اپنے اجزاء کے مجموعے سے بھی بہت بڑا ہے اور عقل کی قلمرو صرف اجزاء تک محدود ہے۔

کوئی شک نہیں کہ وجدان بھی غلطی کرتا ہے' لیکن اس سے اس کی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بالآخر یہ وجدان ہی ہے جو غلطی کا مرتکب نہیں ہوتا اور اس علم کی حدود تک پہنچ سکتا ہے جس کے لئے نفس ہمیشہ متقاضی ہوتا ہے۔ نفس حسن کو خواہ وہ غلط ہو یا صحیح' چاہتا اور اس سے محبت کرتا ہے۔ آخرکار ہمیں صرف احساس پر انحصار کرنا پڑتا

ہے۔ عقل کچھ دُور تک ہمارے ساتھ جاتی ہے' لیکن آخری منزلِ مقصود (یعنی نصب العین صحیح ہو یا غلط) صرف احساس کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہے۔

چونکہ عقل اس راہ میں تھوڑی دُور تک ہمارے ساتھ جاتی ہے' اس لئے ہم منزل پر پہنچ کر سادگی سے اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ عقل نے ہمارا ساتھ بہت دیر ہوئی چھوڑ دیا تھا اور یہ کہ ہم نے راستے کا اہم حصہ احساس کی رفاقت میں طے کیا ہے۔ یہ ایمان' احساس یا وجدان ہی ہے جو فلسفی حتیٰ کہ سائنسدان کو بھی تحریک دیتا ہے کہ وہ تلاشِ حق کے راستے پر گامزن ہو۔ ذہانت وجدان کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے اور اسے ایک خاص سمت میں سرگرم بناتی ہے' لیکن حق کو سب سے پہلے احساس' وجدان یا ایمان کے ذریعے سے ہی محسوس کیا جاتا ہے (خواہ یہ کتنا ہی مبہم کیوں نہ ہو) اور بعد ازاں دریافت کیا جاتا ہے' بلکہ جہاں تک ممکن ہو عقل کے ذریعے اس کا منطقی مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ عقل کے لئے جس شے کا اس طرح مظاہرہ کرنا ممکن ہوتا ہے وہ ہرگز اس شے کے کُل کے برابر نہیں ہو سکتی جس کا ادراک نفس نے بذریعۂ وجدان کیا ہو۔ اس کے برعکس ہم جس علم کو سائنسی اور عقلی قرار دیتے ہیں وہ کبھی کامل طور پر عقلی نہیں ہوتا' بلکہ اس میں ایمان' وجدان اور احساس کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ سائنس کا علم کیوں ہمیشہ بدلتا اور تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اگر فطرت انسان کو ذہانت کے سپرد کر دے اور اس سے ایمان واپس لے لے تو انسان کی تمام سرگرمیاں اس کے ہر دائرہ کار میں رک جائیں۔ اگر اپنے دوست کے متعلق میرے علم میں ایمان کا عنصر نہ ہو تو میں نہایت آسانی سے اسے اپنے جیسا انسان سمجھنے کی بجائے ایک کٹھ پتلی سمجھتا۔ (ایضاً)

غلط نصب العینوں میں اُلجھ جانے کی وجہ سے
خواہشِ عبادت کا الگ ہو کر آزاد ہو جانا

جب ہم آلام و مصائب میں گھرے ہوتے ہیں تو اس وقت کیوں عبادت کرتے